کلیدی خطبہ

بہ موقع

اکتیسواں فقہی سمینار

اسلامک فقہ اکیڈمی (انڈیا)

(۱۰-۱۲) رجمادی الاولی ۱۴۴۴ھ، ۵-۷ رنومبر ۲۰۲۲ء

زیر اہتمام: دار العلوم شیخ علی متقیؒ، برہانپور (مدھیہ پردیش)

از

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی

(جنرل سکریٹری اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا)

اسلامک فقہ اکیڈمی (انڈیا)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد لله رب العالمين والصلاة والسلام علىٰ سيد المرسلين
وعلىٰ آله وأصحابه أجمعين

صدر عالی قدر اور ملک کے مختلف حصوں سے آئے ہوئے علماء وفقہاء!

خوشی کی بات ہے کہ آج ہم لوگ اسلامک فقہ اکیڈمی کے اکتیسویں سالانہ سمینار میں جمع ہیں، اور یہ سمینار ایک اہم تاریخی شہر برہان پور میں منعقد ہو رہا ہے، جہاں سے برصغیر کی بہت سی علمی دینی تاریخیں وابستہ ہیں، نیز یہ دار العلوم شیخ علی متقیؒ کے احاطہ میں ہو رہا ہے، جس کی نسبت ہندستان کے ایک بہت بڑے محدث سے ہے، سنہ ۲۰۰۸ء میں اکیڈمی کا ستر ہواں فقہی سمینار بھی اسی جامعہ میں منعقد ہوا تھا، اور اس نے کامیاب اور عظیم الشان سمینار کی ایک نئی تاریخ رقم کی تھی، اس وقت بھی اس سمینار کے محرک اور بنیادی میزبان حضرت مولانا مفتی محمد رحمت اللہ قاسمی زید مجدہ تھے، اور اب بھی ان ہی کی کوششوں سے فکر ونظر کی یہ محفل آراستہ ہوئی ہے، اللہ تعالیٰ ان کو اور ان کے رفقاء کو بہترین اجر عطا فرمائے۔

برہان پور کے بعد وسط ہند کی اس وسیع وعریض ریاست میں اکیڈمی کے دو اور سالانہ فقہی سمینار منعقد ہوئے، ایک اندور کے قریب بنجاری میں حضرت مولانا تصور حسین فلاحی زید مجدہ کے زیر انتظام اور دوسرے برادران وطن کے مشہور مذہبی شہر اجین میں، حضرت مولانا مفتی جنید احمد فلاحی زید مجدہ کی نگرانی میں، ان میں سے ہر سمینار میں مخلص میزبانوں نے کچھ اس خوش اسلوبی سے میزبانی کی کہ اگر آدمی بھلانا بھی چاہے تو نہیں بھلا سکتا، اللہ تعالیٰ اس تاریخی ریاست کے مسلمانوں پر خصوصی رحم وکرم کا فضل فرمائے اور ان کو دین پر استقامت سے نوازے۔

حضرات! ادھر سالہا سال سے اکیڈمی کے سمیناروں کے افتتاحی پروگرام میں ایک کلیدی خطبہ مسائل حاضرہ پر پیش کرنے اور علماء کو ان کی ذمہ داریوں کی طرف متوجہ کرنے کا

معمول رہا ہے، جس کے محرک تھے اکیڈمی کے سابق سکریٹری حضرت مولانا امین عثمانی رحمۃ اللہ علیہ، اکیڈمی کا انتیسواں سمینار دارالعلوم وقف دیوبند میں منعقد ہونے والا تھا اور اس کے لئے خود ادارہ کے ذمہ داروں نے پیش کش فرمائی تھی؛ لیکن اتر پردیش کے حالات کے پس منظر میں یہ سمینار منعقد نہیں ہوسکا، اور مؤرخہ ۱۔۴/اکتوبر ۲۰۲۱ء کو المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد میں منعقد ہوا، راقم الحروف نے دارالعلوم وقف میں متوقع سمینار کی مناسبت سے کلیدی خطبہ تحریر کیا تھا، جس میں خاص کر علماء دیوبند کے فکری وفقہی اعتدال پر روشنی ڈالی گئی ہے؛ مگر اس کے پیش کرنے کی نوبت نہیں آئی؛ کیوں کہ دیوبند میں سمینار منعقد نہیں ہوسکا، اور حیدرآباد میں وقت کی کمی دامن گیر رہی؛ یہ خطبہ موجودہ حالات میں اہل علم اور اصحاب نظر کے لئے ایک قابل توجہ تحریر ہے؛ اس لئے راقم الحروف اس تحریر کو آج آپ حضرات کی خدمت میں پیش کر رہا ہے، اللہ کرے یہ بے بضاعت سطور مفید ثابت ہوں۔

حضرات! دارالعلوم کا لفظ اصلاً تو مدرسہ اور درسگاہ کے لئے ہے، عام طور پر اس لفظ سے ذہن ایک روایتی تعلیم گاہ کی طرف جاتا ہے، لیکن اگر دارالعلوم دیوبند کو بھی ان ہی معنوں میں دارالعلوم کہا جائے، تو یہ اس کے مقاصد واہداف اور روشن تاریخ سے یا تو ناآگہی ہوگی یا ناانصافی، دارالعلوم محض ایک مدرسہ نہیں؛ بلکہ ایک تحریک ہے، ایک ایسی تحریک جس نے علم دین کی روشنی کو روٴساء واہل ثروت کے عشرت کدوں سے غریبوں اور فاقہ مست مسلمانوں کی جھونپڑیوں تک پہنچایا، جس نے اسلام کے خلاف اُٹھنے والی ہر یورش سے پنجہ آزمائی کی اور اسلام کی فکری سرحدوں کی حفاظت میں ایک لمحہ بھی تغافل کو روا نہیں رکھا، جس کے پیش نظر محض چند کتابوں کا پڑھنا اور پڑھانا اور چند مضامین سے طلبہ کے قلب وذہن کو آشنا کر دینا نہیں تھا؛ بلکہ علماء اُمت کو اس درد سے آشنا کرنا تھا، جو ایک نبی کو اپنی امت کے تئیں ہوا کرتا تھا۔

اسی دردمندی نے یہاں کے فارغین میں ایمانی حمیت اور دینی غیرت کا جذبۂ بے پایاں پیدا کر دیا؛ چنانچہ اس تحریک نے اسلام کے خلاف اُٹھنے والے کن طوفانوں کا منہ نہیں موڑا؟

ہندو احیاء پسندی اور آریہ سماجی تحریک کے مقابلہ کون کھڑا ہوا؟ جب عیسائی پادری اور مناظر ملک کے کوچہ کوچہ میں دولتِ ایمان پر ڈاکہ ڈالنے کے لئے حملہ زن تھے تو بحیثیت جماعت کس نے ان کی شمشیر باطل کو کُند کیا؟ جب عصری تعلیم گاہ سے اعتزال کا فتنہ نئے رنگ وروپ میں ظاہر ہوا اور اس نے نصوص کی اتباع کے مقابلہ عقل پرستی اور خرد نارسا کی اتباع کا صور پھونکا، تو اجتماعی حیثیت سے کس طبقہ نے اس فتنہ کا مقابلہ کیا اور مسلمانوں کو کتاب وسنت کی ابدی حقیقتوں کا قائل کیا؟ جب انگریزوں کی شہ پر پنجاب سے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے ختم نبوت پر وار کرنے کی کوشش کی گئی تو کن حضرات نے مسیلمۂ وقت سے پنجہ آزمائی میں پیش قدمی کی اور ہندستان کے کوچہ کوچہ میں اس فتنہ کا تعاقب کیا؟ جب کچھ لوگوں نے قرآن کے نام کا غلط استعمال کر کے حدیث نبوی ﷺ کا انکار کیا اور اس کے اعتبار و استناد کو نقصان پہنچانے کی کوشش کی تو کن لوگوں نے حدیث کی حفاظت وصیانت کے لئے اپنی قلمی اور ذہنی صلاحیت کو وقف کر دیا؟ جب اس ملک میں عقل ودانش، جمہوریت اور سیکولرزم کے نام پر قانون شریعت کو ہدف بنایا گیا اور مسلمانوں کو ان کے مذہبی اور ثقافتی تشخص سے محروم کرنے کی کوشش کی گئی تو تحفظ شریعت کے جہاد کی سالاری کن لوگوں نے کی؟ ہندستان میں جنگ آزادی کی تحریک ہو یا آزادی کے بعد مسلمانوں کے خلاف ہونے والی سیاسی سازشیں، طبقۂ علماء میں زیادہ تر کن حضرات کو ان کے مقابلہ کی توفیق میسر آئی؟

کوئی بھی حقیقت پسند مؤرخ اگر ان سوالات کا جواب دینا چاہے تو اس کا جواب ''دیوبند اور علماء دیوبند'' ہی ہوگا، قیام دارالعلوم کے بعد سے اسلام کی دعوت واشاعت اور اس کے تحفظ وبقاء کا جو بھی کام اس برصغیر میں ہوا ہے، دیوبند یا تو اس تحریک کا میر کارواں رہا ہے یا کم سے کم اس نے ایک مخلص، فرض شناس اور اپنے مقصد سے عشق کی حد تک محبت رکھنے والے سپاہی کی حیثیت سے اس قافلہ میں شریک ہو کر اپنا فریضہ ادا کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے، یا تو جو روشنی پہلے سے موجود تھی، اس نے اس کی کرنوں میں اضافہ کیا یا بیاباں کی شب تاریک میں

قندیل رہبانی بن کر امت کے لئے قبلہ نما اور خضر طریق کا کام کیا۔ فرحمھم اللہ رحمۃ واسعۃ۔

اسلام کی خدمت واشاعت کا ایک اہم ترین حصہ علوم اسلامی کی خدمت ہے، دارالعلوم کی تاریخ اس باب میں بھی ''ورق ورق روشن'' کا مصداق ہے، کلام وعقیدہ ہو، احسان وتصوف ہو، قرآن کی تفسیر وتوضیح ہو، حدیث کی شرح وتبیین ہو، فقہ اور فقہ کے متعلقات ہوں، عربی زبان وادب اور قواعد وضوابط کا میدان ہو، تاریخ وتذکرہ اور سیرت کا موضوع ہو، اُردو زبان کا تعمیری ادب اور شعر وسخن کی دنیا ہو، ہر فن کی آبیاری اور ہر میکدۂ علم کی قدح خواری میں اس نے اپنا کردار ادا کیا ہے، تاہم فقہ وفتاویٰ دیوبند کی خاص جولان گاہِ تحقیق رہا ہے، ہندستان کی مختلف درسگاہوں کا اپنا اپنا مذاق ہے اور کسی خاص علم کا رنگ اس پر غالب رہا ہے، دیوبند نے گو علوم اسلامی کے ہر شعبہ میں نہایت قیمتی ورثہ چھوڑا ہے؛ لیکن فقہ دیوبند کی بحث وتحقیق اور فکر ونظر کا خاص مرجع رہا ہے۔

فکری اعتبار سے دیوبند کا امتیاز افراط وتفریط سے بچتے ہوئے اعتدال کی شاہراہ تعمیر کرنا ہے، مسلک دیوبند کا خلاصہ اگر ایک لفظ میں بیان کیا جائے تو وہ ہے: اعتدال؛ کیوں کہ دیوبند حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے مسلک ومشرب پر ہے، اور شاہ صاحبؒ کا سب سے بڑا امتیاز فکر ونظر کا اعتدال ہی ہے، حضرت مولانا سید مناظر احسن گیلانیؒ نے شاہ صاحبؒ کی اس فکر پر بڑی خوبصورتی اور گہرائی کے ساتھ روشنی ڈالی ہے، وہ فرماتے ہیں:

> ''اس میں شک نہیں کہ پچھلی صدیوں میں بعض حالات ایسے پیش آئے، خصوصاً اسلام کے اصل سرچشموں یعنی قرآن وحدیث کی تعلیم سے اسلامی مدارس بہت حد تک بیگانے ہوتے چلے گئے، بتدریج یہ اختلافات بہت غلط صورت اختیار کرتے چلے گئے، خصوصاً ماوراء النہر (ترکستان وخراسان) کے حنفی فقہاء کا غلو اس باب میں آہستہ آہستہ بہت آگے بڑھ گیا تھا، اور ہندستان میں وطن بنانے کے لئے اسلام جس راستے سے آیا؛ چوں کہ وہ ان ہی ممالک کا راستہ تھا؛ اس لئے قدرتاً ہندستانی مسلمانوں کی ذہنیت ان ہی ممالک کے علماء کی ذہنیت سے متأثر تھی، پھر نادری اور ابدالی حملوں نے جب اس ملک

میں روہیلوں کے جدید عنصر کا اضافہ کر دیا تو تشدد و تصلب کی یہ شرارت دو آتشہ ہو گئی، شاہ صاحبؒ نے بڑی دانشمندی اور گہرے مطالعہ کے بعد فقہ اور اصول فقہ کی بنیادوں سے پردہ ہٹایا، ائمہ مجتہدین اور ان کے اجتہادات کا جو صحیح مقام تھا، اسے واضح فرمایا'' (حیات طیب ۲/۴۷۶)۔

دیوبند یقیناً اہل سنت والجماعت کی فکر کا ترجمان ونقیب ہے؛ لیکن اس نے سلف صالحین کی قائم کی ہوئی فکر وعمل کی سرحدوں کے دائرہ میں رہتے ہوئے نئے راستے بھی دریافت کئے ہیں، مثلاً علماء دیوبند کا مسلکِ فقہی عمومی طور پر ''حنفیت'' ہے؛ لیکن علم کلام کی تشریح وتوضیح میں انھوں نے ماتریدی نقطۂ نظر پر انحصار نہیں کیا، وہ ماتریدی بھی ہیں اور اشعری بھی، نیز بہت سے مقامات پر صفاتِ باری وغیرہ کی توضیح میں علماء دیوبند نے محدثین کے نقطۂ نظر کو بھی اختیار کیا ہے، احسان وتصوف دیوبند کے خون میں رچا بسا ہے، بانیٔ دارالعلوم اور ان کے رفقاء سے لے کر آج تک ہر عہد میں دیوبند سے ایسے ذاکرین وشاغلین اور اصحاب اصلاح پیدا ہوتے رہے ہیں، جن سے ہزاروں بندگان خدا نے دل کی انگیٹھیوں کو گرم کیا ہے؛ لیکن تصوف میں جو باتیں صوفیاء کے ذاتی مذاق پر مبنی تھیں، یا جن کے لئے کتاب وسنت میں کوئی سند نہیں تھی، دیوبند نے کبھی ان کو اہمیت نہیں دی؛ بلکہ بہت سی وہ باتیں جو مشاہیر صوفیاء کے یہاں موجود تھیں، پورے احترام کے باوجود ان کو بدعت کہنے میں بھی تامل نہیں کیا۔

دیوبند کا فقہی مزاج ومذاق:

جہاں تک دیوبند کے فقہی مزاج ومذاق کی بات ہے تو اکابر دیوبند نے ائمہ کی تقلید شخصی کو نفس پرستی کے فتنہ سے بچانے کے لئے ضروری سمجھا ہے اور ان کا یہ سمجھنا موجودہ حالات میں درست بھی ہے؛ لیکن وہ اس جامد اور غالی تقلید کے بھی روادار نہیں تھے، جو علماء کے ایک گروہ میں پایا جاتا تھا اور جس کی وجہ سے بعض اوقات ''شارع'' اور ''شارح'' کا فرق مٹتا ہوا محسوس ہوتا ہے، جہاں وہ ترک تقلید کو اُصولی طور پر فتنۂ کبریٰ سمجھتے ہیں، وہیں بعض جزوی مسائل میں ظاہر نص کے تقاضوں کو سامنے رکھ کر یا زمانہ کی ضرورتوں کے تحت فقہ حنفی سے عدول کو بھی شجر ممنوعہ

نہیں سمجھتے، بعض دفعہ عامۃ المسلمین کی مشکلات کو حل کرنے کے لئے اور بعض دفعہ موجودہ حالات کے پس منظر میں اباحیت اور فساد فکر وعمل سے بچانے کے لئے وہ دوسرے فقہاء سے بھی استفادہ کرتے رہے ہیں، وہ اپنے مشائخ وفقہاء کے اجتہادات اور تفریعات کا تتبع بھی کرتے ہیں؛ لیکن اس چیز نے کبھی ان کو کتاب وسنت کی نصوص سے دور نہیں کیا، فکر ونظر کا یہ اعتدال دیوبند کی سب سے قیمتی متاع، اس کی وجہ شناخت اور اس کا تمغۂ امتیاز ہے۔

علماء دیوبند کے مسلک ومشرب اور مزاج ومذاق کے غالباً سب سے بڑے ترجمان حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ نے دارالعلوم کے مسلک پر ان الفاظ میں روشنی ڈالی ہے:

> علمی حیثیت سے یہ ولی اللّٰہی جماعت، مسلکاً اہل سنت والجماعت ہے، جس کی بنیاد کتاب وسنت اور اجماع وقیاس پر قائم ہے، اس کے نزدیک تمام مسائل میں اولین درجہ نقل روایت اور آثار سلف کو حاصل ہے، جس پر پورے دین کی عمارت کھڑی ہوئی ہے، اس کے یہاں کتاب وسنت کی مراد محض قوتِ مطالعہ سے نہیں؛ بلکہ اقوالِ سلف اور ان کے متوارث مذاق کی حدود میں محدود رہ کر نیز اساتذہ اور شیوخ کی صحبت وملازمت اور تعلیم وتربیت ہی سے متعین ہوسکتی ہیں، اسی کے ساتھ عقل ودرایت اور تفقہ فی الدین بھی اس کے نزدیک فہم کتاب وسنت کا ایک بڑا اہم جزو ہے، وہ روایات کے مجموعے سے شارح علیہ السلام کی غرض وغایت کو سامنے رکھ کر تمام روایات کو اسی کے ساتھ وابستہ کرتا ہے اور سب کو درجہ بدرجہ اپنے اپنے محل پر اس طرح چسپاں کرتا ہے کہ وہ ایک ہی زنجیر کی کڑیاں دکھائی دیں؛ اس لئے جمع بین الروایات اور تعارض کے وقت تطبیق احادیث اس کا خاص اُصول ہے، جس کا منشاء یہ ہے کہ وہ کسی ضعیف سے ضعیف روایت کو بھی چھوڑنا اور ترک کردینا نہیں چاہتا، جب تک کہ وہ قابل احتجاج ہو، اسی بنا پر اس جماعت کی نگاہ میں نصوص شرعیہ میں کہیں بھی تعارض اور اختلاف محسوس نہیں ہوتا؛ بلکہ سارے کا سارا دین تعارض اور اختلاف سے مبرا رہ کر ایک ایسا گلدستہ دکھائی دیتا ہے، جس میں ہر رنگ کے علمی وعملی پھول اپنے اپنے موقع پر کھلے ہوئے نظر آتے ہیں، اسی کے ساتھ بطریق اہل سلوک جو رسمیات اور رواجوں اور نمائشی حال وقال سے مبرا اور بری ہے، تزکیۂ نفس اور اصلاحِ باطن بھی اس کے مسلک میں ضروری ہے (تاریخ دارالعلوم ۴۲۴:۳-۴۲۵)۔

علماء دیوبند تقلید کے قائل تھے؛ کیوں کہ موجودہ دور میں اتباع ہویٰ سے بچنے کے لئے تقلید ایک ضرورت ہے؛ لیکن اس مسئلہ میں بھی ان کے یہاں اعتدال پایا جاتا تھا، بقول حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ:

''پس وہ بلا شبہ مقلد اور فقہ معین کے پابند ہیں؛ مگر اس تقلید میں بھی محقق ہیں، جامد نہیں (علماء دیوبند کا دینی رخ اور مسلکی مزاج: ۱۴۳)۔

اس مزاجِ اعتدال کو خود بانیٔ دار العلوم حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے یہاں ملاحظہ کیا جاسکتا ہے، حضرت نانوتویؒ کا زمانہ وہ تھا، جب ایک گروہ امام ابوحنیفہؒ اور مقلدین پر نہ صرف طعن وتشنیع کرتا تھا؛ بلکہ ان کو گمراہ اور ضال ومضل قرار دینے سے بھی نہیں چوکتا تھا؛ اس لئے حضرت نانوتویؒ کو ایسے بعض مسائل پر قلم اُٹھانا پڑا، ان ہی رسائل میں ایک ''توثیق الکلام'' ہے، حضرت نانوتویؒ نے اپنی بحث میں یہ بات ثابت کی ہے کہ امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ کی تلاوت کا حکم نہیں؛ لیکن ان کی شانِ اعتدال دیکھئے کہ اخیر میں فرماتے ہیں:

''اس پر بھی امام ابوحنیفہؒ پر طعن کئے جائیں اور تارکین قرأت پر عدم جواز صلوٰۃ کا الزام ہوا کرے تو کیا کیجئے، زبان قلم کے آگے کوئی آڑ نہیں، دیوار نہیں، پہاڑ نہیں، ہم کو دیکھئے باوجود توجیہات مذکورہ اور استماع تشنیعات معلومہ فاتحہ پڑھنے والوں سے دست وگریبان نہیں ہوتے؛ بلکہ یوں سمجھ کر کہ ہم تو کس حساب میں ہیں، امام اعظمؒ بھی باوجود عظمت وشان امکان خطاء سے منزہ نہیں، کیا عجب ہے کہ امام شافعی علیہ الرحمہ صحیح فرماتے ہوں اور ہم ہنوز ان کے قول کی وجہ نہ سمجھتے ہوں، اس امر میں زیادہ تعصب کو پسند نہیں کرتے، پر جس وقت امام علیہ الرحمہ کی توہین سنی جاتی ہے، دل جل کر خاک ہوجاتا ہے اور یوں جی میں آتا ہے کہ ان زبان درازیوں کے مقابلہ میں ہم بھی لن ترانیوں پر آجائیں، اور دو چار ہم بھی سنائیں، پَر آیت: **واذا خاطبھم الجاھلون قالوا سلاما واذامروا باللغو مروا کراما** اور احادیث منع نزاع مانع ہیں'' (توثیق الکلام فی الانصاف خلف الامام: ۲۳)۔

اس سے بڑھ کر اعتدال اور کیا ہوسکتا ہے کہ قرأت خلف الامام کو وہ ناجائز یا مکروہ نہیں

کہتے ؛ بلکہ خلاف احسن کہتے ہیں ؛ چنانچہ فرماتے ہیں: ''ترک قرأت خلف الامام قرأت فاتحہ سے خیر اور احسن معلوم ہوتا ہے''۔

تقلید میں اعتدال کے مختلف پہلو ہیں، ایک یہ ہے کہ دوسرے نقطۂ نظر کا بھی احترام ملحوظ رہے، اس کو بالکل باطل نہ ٹھہرایا جائے، دوسرے: اپنے مذہب کی کسی رائے کو نص شرعی کا درجہ نہ دیا جائے، تیسرے: بوقت ضرورت دوسرے نقطۂ نظر سے بھی استفادہ کیا جائے، چوتھے: ان مسائل کو امت میں انتشار اور نزاع کا باعث نہ بنایا جائے، یہ چاروں پہلو علماء دیوبند کے یہاں پائے جاتے ہیں، مثلاً تراویح کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''ایک عرض یہ ہے کہ بندہ کمترین عاملان حدیث کو اگر ان میں فہم ہو برا نہیں سمجھتا؛ بلکہ عمل بالحدیث کو ایمان کا شعار جانتا ہے؛ لیکن آپ کے گرامی نامہ کے مضامین جن لوگوں کے تحریر کردہ ہیں، ایسے بدفہموں کے لئے ہرگز عمل بالحدیث کو جائز نہیں سمجھتا، ایسے تو یضل بہ کثیرا کے زمرہ میں آتے ہیں، عقل مند کے لئے اشارہ کافی ہے (لطائف قاسمیہ: ۱۴)۔

دوسرے مذاہب کے احترام کے سلسلہ میں حضرت نانوتویؒ کا انداز فکر گزشتہ اقتباس سے ظاہر ہے کہ ''قرأۃ فاتحہ خلف الامام'' کہ جس کو فقہی اختلاف کے اعتبار سے معرکۃ الآراء سمجھا جاتا ہے، فرماتے ہیں:

''کیا عجب ہے کہ امام شافعی علیہ الرحمہ صحیح فرماتے ہوں اور ہم ہنوز ان کے قول کی وجہ نہ سمجھتے ہوں، اس امر میں زیادہ تعصب کو پسند نہیں کرتے'' (توشیق الکلام: ۲۳، الدلیل المحکم: ۱۷)۔

ایک اور موقع پر فرماتے ہیں:

اس لئے اہل اسلام کو یہ ضروری ہے کہ ایسے مسائل میں خواہ مخواہ ایسے پکے نہ ہو بیٹھیں کہ دوسری طرف کو بالکل باطل سمجھ لیں (جمال قاسمی: ۹)۔

مسائل فقہیہ میں ہی نہیں ؛ بلکہ اعتقادی مسائل میں بھی اگر وہ اساسی حیثیت کے حامل نہ ہوں تو حضرت نانوتویؒ یہی طریقہ اختیار فرماتے ہیں، جیسے حیات النبی کا مسئلہ اہل سنت

والجماعت کے درمیان اختلافی رہا ہے، آپؒ نے ''آبِ حیات'' خاص اسی موضوع پر تالیف فرمائی ہے، اپنے ایک مکتوب میں اس مسئلہ کا ذکر کرتے ہوئے اخیر میں فرماتے ہیں:

''زیادہ کیا عرض کروں، ہاں اتنا عرض کئے دیتا ہوں کہ گو عقیدہ یہی ہے، اور میں جانتا ہوں انشاء اللہ تعالیٰ ایسا ہی رہے گا؛ مگر اس عقیدہ کو عقائد ضروریہ میں سے نہیں سمجھتا، نہ تعلیم ایسی باتوں کی کرتا ہوں نہ منکروں سے دست وگریبان ہوتا ہوں، خود کسی سے کہتا نہیں پھرتا، کوئی پوچھتا ہے اور اندیشۂ فساد نہیں ہوتا تو اظہار میں دریغ بھی نہیں کرتا، آپ بھی اس امر کو ملحوظ رکھیں تو بہتر ہے، فقط (لطائف قاسمیہ: ۵)۔

حضرت نانوتویؒ کے تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے کہ بعض دفعہ اتباع سنت کے جذبہ سے دوسری آراء پر بھی عمل کرلیا کرتے تھے؛ چنانچہ آپؒ کے تلمیذ رشید حضرت مولانا حکیم محمد منصور علی مرادآبادیؒ لکھتے ہیں:

''عمل ان کا حنفی تھا؛ مگر ہر سنت کی اتباع میں بہت خیال رکھتے تھے، اور کبھی کبھی خلافی مسائل پر بھی عمل کر لیتے تھے'' (مذہب منصور ۲/ ۱۹۲)۔

فروعی اور غیر اہم مسائل پر بحث وتکرار، مناظرہ بازی اور شدت پسندی کو حضرت نانوتویؒ بہت ناپسند فرماتے تھے؛ چنانچہ ایک خط کا جواب دیتے ہوئے فرماتے ہیں:

''کیا خدا کی قدرت ہے کہ آج کل جس طرف سے صدا آتی ہے، یہی آتی ہے کہ وہاں مسلمانوں میں اختلاف ہے، وہاں نزاع ہے، کہیں سے اتفاق کی خبریں نہیں آتیں، ہاں کفار کے جتنے افسانے سنے جاتے ہیں کہ یوں اتفاق ہے، اس طرح اتحاد ہے کہ خیر بجز إنا لله وإنا إليه راجعون کے اور کیا کہئے، آپ کی خوشنودی خاطر منظور ہے؛ اس لئے جواب لکھتا ہوں؛ ورنہ ایسے جھگڑوں میں دخل دینا محض فضول سمجھتا ہوں'' (الامام محمد قاسم نانوتوی، حیات افکار وخدمات: ۲۶۵)۔

حضرت نانوتویؒ کے سب سے معتمد رفیق اور تحریک دیوبند کے ثانی اثنین حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ تھے، اعتقادات کے باب میں علماء دیوبند نے آپ ہی کو اپنا مقتدا بنایا

ہے؛ لیکن اعتدال کا جو رنگ حضرت نانوتویؒ کے یہاں ہے، وہی رنگ حضرت گنگوہیؒ کے یہاں ملتا ہے، ان اعتقادی مسائل میں بھی جن میں اہل سنت والجماعت کے درمیان اختلاف ہے، اور فقہی مسائل میں بھی؛ چنانچہ سماع موتی اور اس پر مبنی مشہور مسئلہ کہ تدفین کے بعد مردہ پر تلقین کی جائے گی یا نہیں؟ لکھتے ہیں:

''یہ مسئلہ عہد صحابہ سے مختلف فیہ رہا ہے، اس کا فیصلہ کوئی نہیں کرسکتا، تلقین کرنا بعد دفن کے اس پر ہی مبنی ہے، جس پر عمل کرے، درست ہے، فقط واللہ تعالیٰ اعلم'' (فتاویٰ رشیدیہ: ۱۰۸)۔

حضرت گنگوہیؒ بھی تقلید کے نہ صرف قائل ہیں؛ بلکہ فی زمانہ عوام کے لئے اس کو واجب قرار دیتے ہیں، اور کسی بھی امامِ مذہب کی شان میں تقصیر کو ناپسند کرتے ہیں؛ چنانچہ ایک سوال کے جواب میں فرماتے ہیں:

''تقلید ایک امام کی درست ہے اور عوام کو بسبب خلاف اور فساد فتنہ کے ایک کی تقلید واجب ہے'' (باقیات فتاویٰ رشیدیہ: ۴۰۵)۔

ایک صاحب نے سوال کیا کہ اگر کوئی شخص مجتہدین یا مقلدین کو برا نہ کہے، سب کو اپنا پیشوا ومقتدا سمجھے، اور حدیث سے جو چیز ثابت ہو، اس کے ظاہر پر عمل کرے، جس میں مذاہب اربعہ میں سے کسی کی موافقت ہو اور عوام میں فتنہ وفساد کا باعث بھی نہ بنے تو اس کا یہ عمل درست ہے یا نہیں؟ حضرت گنگوہیؒ اس کے جواب میں فرماتے ہیں:

''اس صورت میں اگر ہوائے نفسانی سے بھی خالی ہے تو اس کو جائز ہے کہ کسی مذہب کے موافق عمل کرے، فقط واللہ تعالیٰ اعلم'' (فتاویٰ رشیدیہ: ۲۳۷)۔

ایک صاحب نے دریافت کیا کہ عام مسلمان جو مجتہد نہ ہو، علماء وقت سے تحقیق کرے یا فروع واصول مسائل میں مذاہب مروجہ میں سے کسی ایک مذہب پر چلے؟ اس کے جواب میں فرماتے ہیں:

''عامی کو کسی عالم محقق متدین سے پوچھنا کافی، اور فرض امر سوال سے ادا ہوجانے کو بس ہے، خواہ ایک ہی عالم سے پوچھا کرے، خواہ متعدد علماء سے، اور خواہ ایک مذہب معین

کے علماء سے، خواہ مذاہب متعددہ کے، لقولہ علیہ السلام :أو لم یکن شفاء العي السؤال الحدیث ترجمہ : ''کیا بیماری کی دوا سوال نہ تھا'' کہ اس میں سوال مطلق ہے، کوئی قید نہیں، اور امتثال مطلق میں جس فرد مطلق پر عمل ہووے گا، اداء فرض حاصل ہوجاتا ہے، پس اصول عقائد واخلاق میں تو تمام علماء کا اتفاق ہے، اس میں تو سب متفق ہیں اور فروعی مسائل میں جوابات مختلف ہیں، پس فروع میں ہر چند متعدد علماء سے سوال کرنا درست ہے، خصوصاً احوط کا اختیار کرنا، مگر حسب مشاہدہ زمانہ موجود کے یہ بھی محقق ہے کہ عامی کو متعدد علماء سے سوال کرنے میں ابتلاء مرض تلہی فی الدین کا ہوجاتا ہے، اور لا اُبالی دین میں بن جاتا ہے'' (باقیات فتاویٰ رشیدیہ:۴۰۶)۔

حضرت گنگوہیؒ کے زمانہ میں بعض غالی اہل حدیث، احناف اور مقلدین کو برا بھلا کہتے تھے، یہاں تک کہ تقلید کو شرک قرار دیتے تھے، اس کے ردعمل میں دوسری طرف سے مسلک اہل حدیث کو اہل سنت والجماعۃ کے دائرے سے باہر قرار دیا جاتا تھا، اس سلسلہ میں حضرت گنگوہیؒ کا اعتدال دیکھئے، اس پس منظر میں مشہور اہل حدیث عالم مولانا سید نذیر حسین محدث دہلویؒ کے بارے میں دریافت کیا گیا کہ لوگ ان کو مردود اور خارج از اہل سنت جانتے ہیں، کیا یہ صحیح ہے؟ اس کے جواب میں رقمطراز ہیں:

.....اگرچہ ان کو مردود اور خارج اہل سنت سے کہنا بھی سخت بے جا ہے، عقائد میں سب متحد مقلد غیر مقلد ہیں؛ البتہ اعمال میں مختلف ہوتے ہیں، واللہ تعالیٰ اعلم (فتاویٰ رشیدیہ:۲۳۹)۔

چنانچہ حضرت گنگوہیؒ نفسانیت سے بچتے ہوئے عذر کی بناء پر یا دوسرے مذہب کی دلیل شرعی پر مطمئن ہوجانے کی صورت میں اس پر عمل کی اجازت دیتے ہیں، آپ کا ایک ملفوظ فتاویٰ رشیدیہ میں اس طرح نقل کیا گیا:

''مذاہب سب حق ہیں، مذہب شافعی پر عند الضرورۃ عمل کرنا کچھ اندیشہ نہیں؛ مگر نفسانیت اور لذت نفسانی سے نہ ہو، عذر یا حجت شرعیہ سے ہووے، کچھ حرج نہیں، سب مذاہب کو حق جانے، کسی پر طعن نہ کرے، سب کو اپنا امام جانے، فقط (فتاویٰ رشیدیہ:۲۴۰)۔

اسی اصول پر آپ جمع بین الصلاتین سے متعلق سوال کا جواب دیتے ہوئے فرماتے ہیں:

''یہ مسئلہ مقلد کے دوسرے امام کے مذہب پر عمل کرنے کا ہے تو وقت ضرورت کے جائز ہے، عامی کو کہ اس کو سب کو حق جاننا چاہئے، اگر اپنے امام کے مذہب پر عمل کرنے میں دشواری ہو تو دوسرے امام کے قول پر عمل کر لیوے، اس قدر تنگی نہ اُٹھاوے کہ یہ موجب ضرر اور حرج دین کا ہوتا ہے، فقط، یہی مذہب اپنے اساتذہ کا ہے، جیسا استاذ الاساتذہ شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے'' (فتاویٰ رشیدیہ: ۳۰۰)۔

اختلافی مسائل سے متعلق حضرت گنگوہیؒ کے فتاویٰ میں قدم قدم پر اس رجحان کو دیکھا جاسکتا ہے، ایک صاحب نے سوال کیا ہے کہ اگر کوئی حنفی امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ پڑھے، کیا اس کی نماز ہوجائے گی؟ اس کے جواب میں رقمطراز ہیں:

''جو حنفی فاتحہ پڑھتا ہے خلف (امام) کسی وجہ تحقیق سے، کہ اس کو بسبب اپنے علم یا تحقیق کے، اس خاص مسئلہ کی حقیقت اور ترجیح واضح ہوگئی، اس کی نماز ہوجاتی ہے، یہ کہنا کہ اس کی نماز نہیں ہوئی، نامناسب امر ہے'' (باقیات فتاویٰ رشیدیہ: ۱۷۰)۔

آپ کے یہاں مختلف فیہ مسائل کا جواب دینے میں مخالف نقطۂ نظر کا احترام ایک ایسی بات ہے، جو موجودہ دور کے علماء کے لئے قابل تقلید ہے؛ چنانچہ رفع یدین سے متعلق ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے کہتے ہیں:

''میرا مسلک عدم رفع کا ہے کہ عدم رفع میرے نزدیک مرجح ہے، جیسا کہ زیادہ تر حنفیہ نے فرمایا ہے، اور طعن بندہ کے نزدیک دونوں پر روا نہیں، کہ مسئلہ مختلف فیہا ہے، اور احادیث دونوں طرف موجود ہیں اور عمل صحابہ بھی، اور قوت وضعف مختلف ہوتے ہیں، بالآخر دونوں معمول بہا ہیں'' (فتاویٰ رشیدیہ: ۳۱۰)۔

یہی جواب آمین بالجہر کے بارے میں بھی دیا گیا ہے (فتاویٰ رشیدیہ: ۳۱۱)۔

اگر کسی ایسے مسئلہ پر گفتگو کرنی ہو، جس میں اختلاف ہو اور دونوں پہلو حدیث سے ثابت ہوں تو بہت ہی انصاف کے ساتھ دونوں نقطۂ نظر کو نقل فرماتے ہیں، جیسے تشہد میں اشارہ

بالسبابہ کی صورت میں کب تک انگلیاں باندھ کر رکھی جائیں، فرماتے ہیں:

''بعض علماء حنفیہ اول کھول کر ہاتھ رکھتے ہیں، اور وقت اشارہ کے عقد کرتے ہیں، اس کا پتہ بھی حدیث سے ملتا ہے، اور ملا علی قاریؒ نے لکھا ہے کہ اول سے ہی عقد کر کے ہاتھ رکھے، یہ بھی درست معلوم ہوتا ہے، دونوں طرح پر عمل درست ہے، فقط واللہ تعالیٰ اعلم'' (فتاویٰ رشیدیہ: ۳۱۲)۔

سورۂ فاتحہ یا دیگر سورتوں کے شروع میں امام کے جہر کے ساتھ بسم اللہ پڑھنے کے سلسلہ میں اختلاف رائے نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں:

''بہر حال دونوں طرح درست ہے، ایسے امور میں خلاف ونزاع مناسب نہیں کہ سب مذاہب صحیح ہیں'' (فتاویٰ رشیدیہ: ۳۱۹)۔

چنانچہ حضرت گنگوہیؒ کا عام اسلوب یہی ہے کہ ترجیح میں فقہاء کے اقوال کے ساتھ ساتھ نصوص کی تائید کو بھی پیش نظر رکھتے ہیں، جیسے نماز عصر کے وقت کے سلسلہ میں آپ نے ایک مثل پر عصر کا وقت شروع ہونے کو ترجیح دی ہے اور لکھا ہے: بندہ کے نزدیک ایک مثل کو زیادہ قوت ہے (فتاویٰ رشیدیہ: ۲۹۹)۔

اس طرح کی مثالیں حضرت گنگوہیؒ کے فتاویٰ اور بخاری اور ترمذی پر ان کے تشریحی نوٹ میں جگہ جگہ ملتی ہیں، ایک اہم بات یہ بھی ہے کہ جہاں فقہاء متأخرین نے کوئی ایسی بات کہی ہے، جو ظاہر حدیث کے خلاف ہے تو حضرت گنگوہیؒ نے اس سے دامن بچایا ہے، حضرت مولانا محمد یوسف بنوریؒ حضرت گنگوہیؒ کی خدمت حدیث پر گفتگو کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اس کے علاوہ فقہاء حنفیہ متأخرین کی تفریعات جو حدیث کے خلاف تھیں، ان کی فقہ حنفی سے برأت کی، علاوہ ازیں فقہ میں توسع اور تضییق کے درمیان اعتدال کی راہ اختیار کی'' (ماہنامہ بینات، بنوری نمبر: ۱۰۴ ــ ۱۹۷۸ء)۔

اس لئے حضرت گنگوہیؒ درس حدیث میں فقہی اختلاف سے زیادہ دفع تعارض پر توجہ دیتے تھے؛ چنانچہ مولانا عبدالحئی حسنیؒ نے درس حدیث کے منہج کے سلسلہ میں خود مولانا کے الفاظ

کواس طرح نقل کیا ہے:

''(حدیث میں) اصل مقصود کی طرف توجہ رہی، اصل مقصود یہ ہے کہ اشکال حدیث کا حل کیا جائے، تعارض رفع کیا جائے، مسئلہ ثابت کیا جائے، تفقہ حاصل ہو، اسی کی طرف میرا خیال رہا، حنفی شافعی جو ہوں، اپنا مسئلہ ثابت کریں'' (مقدمہ باقیات فتاویٰ رشیدیہ: ۷، بحوالہ دہلی اوراس کے اطراف، ازمولانا عبدالحیٔ حسنیؒ: ۱۲۹–۱۳۰)۔

متأخرین کی تفریعات کے مقابلہ ظاہر حدیث کو بھی ترجیح دینے کی متعدد مثالیں امید ہے کہ حضرت گنگوہیؒ کے فتاویٰ میں مل جائیں گی، اسی کی ایک مثال جماعت شروع ہونے کے بعد فجر کی سنت سے متعلق ملاحظہ کی جاسکتی ہے، فرماتے ہیں:

''مذہب حنفیہ یہ ہے کہ سنت پڑھ کر شریک جماعت ہو؛ بشرطیکہ سنت کو پردہ میں پڑھے، جماعت کے روبرو پڑھنا ہرگز درست نہیں؛ مگر اس وقت میں ایسا کرنے سے عوام جماعت کے پاس سنت پڑھنے لگتے ہیں؛ لہٰذا حسب مذہب شافعی اور محدثین علیہم الرحمہ کے بالکل سنت سے منع کرنا مناسب وقت ہے'' (باقیات فتاویٰ رشیدیہ: ۱۸۱)۔

یہی رنگ اعتدال ہمیں علامہ انورشاہ کشمیریؒ کے یہاں ملتا ہے، جیسے نماز کے بعد ہاتھ اُٹھا کر دعاء یا اجتماعی دعاء کے مسئلہ پر روشنی ڈالتے ہوئے فرماتے ہیں:

''واعلم أن الأدعية بهذه الهيئة الكذائية لم تثبت عن النبي صلى الله عليه وسلم ولم يثبت عنه رفع الأيدى دبر الصلوات في الدعوات الا أقل قليل، و مع ذلک وردت فيه ترغيبات قولية، والأمر في مثله أن لا يحكم عليه بالبدعة، فهذه الأدعية فى زماننا ليست بسنة بمعنىٰ ثبوتها عن النبي صلى الله عليه وسلم وليست ببدعة بمعنى عدم أصلها في الدين'' (فیض الباری: ۲/۱۶۷)۔

جان لو! کہ اس ہیئت کذائی کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دعائیں ثابت نہیں ہیں، اور آپ سے نمازوں کے بعد ہاتھ اُٹھا کر دعاء کرنا بہت ہی کم ثابت ہے؛ لیکن بہر حال آپ کے ترغیبی اقوال منقول ہیں، اور ایسے عمل پر بدعت کا حکم نہیں لگایا جاسکتا؛ لہٰذا ہمارے زمانہ میں یہ دعائیں نہ اس معنیٰ میں سنت ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے

ثابت ہیں، اور نہ اس معنیٰ میں بدعت ہے کہ دین میں اس کی کوئی اصل نہیں''۔

قرأت فاتحہ خلف الامام کو متأخرین نے جہری اور سری دونوں طرح کی نمازوں میں منع کیا ہے؛ لیکن علامہ کشمیریؒ کو اس سے اتفاق نہیں، فرماتے ہیں:

''وأما الامام أبو حنيفه رحمه الله تعالىٰ فالمحقق عندى من مذهبه أنه حجر عن القراءة في الجهرية وأجاز بها في السرية كما نقله صاحب الهداية عن محمد بن الحسن رحمه الله تعالىٰ، وان أنكره الشيخ ابن الهمام رحمه الله تعالىٰ حيث قال: لم أجده في المؤطأ وكتاب الآثار، قلت: والصواب ما ذكره صاحب الهداية، فان تناقل المشائخ برواية يكفى لثبوتها لا يشترط أن تكون مكتوبة فى الأوراق أيضا، فقد تكون روايته عن امام وتنقل على الأسئلة ولا توجد الكتب'' (فیض الباری ۲/ ۲۷۲)۔

''میرے نزدیک امام ابوحنیفہؒ کا مذہب محقق یہ ہے کہ وہ جہری نمازوں میں امام کے پیچھے قرأت کو منع کرتے ہیں، سری نمازوں میں اجازت دیتے ہیں، جیسا کہ صاحب ہدایہ نے امام محمدؒ سے نقل کیا ہے؛ اگرچہ علامہ ابن ہمامؒ نے اس کا انکار کیا ہے اور کہا ہے کہ مؤطا اور کتاب الآثار میں اس کا ذکر نہیں ہے؛ لیکن میں کہتا ہوں کہ صاحبِ ہدایہ کی نقل درست ہے، اگر مشائخ کسی بات کو زبانی روایت کریں تو یہ اس کے ثبوت کے لئے کافی ہے، یہ شرط نہیں ہے کہ وہ بات اوراق میں بھی لکھی ہوئی ہو، بعض دفعہ امام سے ایک روایت منقول ہوتی ہے، وہ زبانی نقل کی جاتی ہے اور کتابوں میں نہیں پائی جاتی''۔

رکوع اور سجدہ میں دعاء کے سلسلہ میں گفتگو کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''ثم ان ابن أمير الحاج صرح بجواز الأدعية كلها، حتى في الجماعات بشرط عدم التثقيل على القوم، وراجع المواهب اللدنية لمواضع الأدعية من الصلاة؛ فانه بسطها جدا، وما فى المبسوط لشمس الأئمة من عدم جواز الأذكار في الفرائض فهو متروك عندي، والمختار ما قرره ابن أمير الحاج'' (فیض الباری ۲/ ۳۰۱)۔

''ابن امیر الحاجؒ نے صراحت کی ہے کہ رکوع وسجدہ میں تمام دعائیں جائز ہیں، یہاں

تک کہ اگر قوم پر گراں گزرنے کا اندیشہ نہ ہو تو جماعت کی نمازوں میں بھی، مواہب لدنیہ میں جہاں نماز کی دعاؤں کا ذکر آیا ہے، وہاں انھوں نے تفصیل سے لکھا ہے، اور شمس الائمہ سرخسیؒ نے جو مبسوط میں لکھا ہے کہ فرائض میں اذکار جائز نہیں ہیں، میرے نزدیک یہ قول درست نہیں ہے، درست بات وہ ہے جو ابن امیر الحاجؒ نے کہی ہے''۔

نماز تراویح کے سلسلہ میں عام طور پر ہمارے یہاں یہ بات کہی جاتی ہے کہ تراویح اور تہجد دو الگ الگ جماعتیں ہیں، اور بعض روایتوں میں بھی اس کا اشارہ موجود ہے؛ لیکن علامہ کشمیریؒ فرماتے ہیں:

''قال عامة العلماء:ان التراويح وصلاة الليل نوعان مختلفان، والمختار عندي أنهما واحد، وان اختلفت صفتاهما كعدم المواظبة على التراويح وأدائها بالجماعة وأدائها في أول الليل تارة وايصالها الى السحر أخرى بخلاف التهجد، فانه كان في آخر الليل ولم تكن فيه الجماعة، وجعل اختلاف الصفات دليلا على اختلاف نوعيهما ليس بجيد عندي؛ بل كانت تلك صلاة واحدة، اذا تقدمت سميت باسم التراويح، واذا تأخرت سميت باسم التهجد'' (فیض الباری ۲/۴۲۰)۔

''عام طور پر علماء کہتے ہیں کہ تراویح اور تہجد دو الگ الگ نمازیں ہیں؛ لیکن میرے نزدیک راجح یہ ہے کہ یہ دونوں ایک ہی ہیں؛ اگرچہ ان دونوں کی صفتیں مختلف ہیں، جیسے: تراویح پر عدم مواظبت، جماعت سے ادائیگی اور اول شب میں ادا کرنا اور اسے وقت سحر تک پہنچانا، بخلاف تہجد کے کہ وہ آخر شب میں ہوتی ہے، اس میں جماعت نہیں ہے، اور صفات کا اختلاف الگ الگ نوع ہونے پر دلالت نہیں کرتا؛ اس لئے یہ بات (تراویح اور تہجد کا دو الگ الگ نماز ہونا) میرے نزدیک پسندیدہ نہیں ہے؛ بلکہ یہ ایک ہی نماز ہے، پہلے پڑھی گئی تو اسے تراویح کہا گیا، اور دیر سے پڑھی گئی تو اسے تہجد کا نام دیا گیا''۔

اسی طرح مخالف فی الفروع کی اقتداء کے سلسلہ میں فرماتے ہیں:

''قلت: والذي تحقق عندي أنه صحيح مطلقا سواء كان الامام محتاطا أم لا،

وسواء شاهد منه تلك الأمور أم لا، فاني لا أجد من السلف أحدا اذا دخل في المسجد أنه تفقد أحوال الامام أو تساءل عنه‘‘ (فیض الباری: ۱/۳۰۱)۔

میں کہتا ہوں: میرے نزدیک جو بات بہ تحقیق ثابت ہے، وہ یہ ہے کہ مخالف فی الفروع امام کی اقتداء مطلقاً درست ہے، چاہے امام محتاط ہو یا نہ ہو، اور چاہے اس سے وہ باتیں دیکھی جائیں، جو مقتدی کے نزدیک ناقض وضوء ہیں، یا نہ دیکھی جائیں؛ اس لئے کہ میں سلف میں سے کسی کو نہیں پاتا کہ جب وہ مسجد میں داخل ہوتے تو امام کے احوال معلوم کرتے یا اس کے بارے میں دریافت کرتے‘‘۔

حلقۂ دیوبند میں حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کو تفقہ میں جو درجہ ومقام حاصل تھا، وہ محتاج اظہار نہیں، حضرت تھانویؒ احکام فقہیہ میں تقلید کے قائل تھے؛ لیکن تقلید میں غلو کو بھی اسی درجہ ناپسند فرماتے تھے، مولانا تھانویؒ نے تقلید کی حقیقت کو سمجھاتے ہوئے لکھا ہے :

’’تقلید کی حقیقت یہ نہیں ہے کہ امام کے قول کو حدیث و قرآن سے زیادہ سمجھا جاتا ہے؛ بلکہ یہ حقیقت ہے کہ ہم کو اتنا علم نہیں، جتنا کہ ان فقہاء کو تھا، جنھوں نے فقہ کو مرتب کیا، نصوص سے جس فہم اور احتیاط کے ساتھ وہ مسائل کا استخراج کر سکتے تھے، ہم نہیں کر سکتے‘‘ (وعظ الصالحین: ۳۱)۔

ایک اور موقعہ پر تقلید شخصی کے موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

’’اس حکم کو مقصود بالذات سمجھنا بے شک بدعت ہے؛ لیکن مقصود بالغیر سمجھنا یعنی مقصود بالذات کا مقدمہ سمجھنا یہ بدعت نہیں؛ بلکہ طاعت ہے‘‘ (بوادر النوادر: ۷۹)۔

اگر کسی فقہی جزئیہ کے مقابلہ میں نص صریح مل جائے تو کیا رویہ ہونا چاہئے؟ اس سلسلہ میں فرماتے ہیں :

’’اگر کسی اور جزئی میں بھی ہم کو معلوم ہو جائے کہ حدیث صریح منصوص کے خلاف ہے تو چھوڑ دیں گے اور یہ تقلید کے خلاف نہیں‘‘ (حسن العزیز ۲/ ۳۷۰)۔

ایک موقع پر فرماتے ہیں :

''بعض اہل تعصب کو ائمہ کی تقلید میں ایسا جمود ہوتا ہے کہ وہ امام کے قول کے سامنے احادیث صحیحہ غیر معارضہ کو بے دھڑک رد کر دیتے ہیں، میرا تو اس سے رونگٹا کھڑا ہو جاتا ہے'' (اشرف المعلومات:۱۹)۔

ایک اور موقع پر رقم طراز ہیں :

''اگر امام کی دلیل سوائے قیاس کے کچھ نہ ہو اور حدیث معارض موجود ہو تو قول امام چھوڑ دیا جاتا ہے، جیسے ''ما أسکر کثیرہ فقلیلہ حرام'' میں ہوا ہے کہ امام صاحبؒ نے قدرِ غیر مسکر کو جائز کہا ہے اور حدیث میں اس کے خلاف کی تصریح موجود ہے، یہاں امام صاحبؒ کے قول کو چھوڑ دیتے ہیں؛ مگر اس کے لئے بڑے تبحر کی ضرورت ہے'' (حسن العزیز ۴/ ۳۹۷)۔

احکام فقہیہ میں استدلال کا کیا طریق ہونا چاہئے؟ اس بارے میں لکھتے ہیں :

''توحید و رسالت اور عقائد اصل ہیں اور قطعی دلائل پر قائم ہیں، اس میں مذاہب حقہ سب شریک ہیں، آگے فروع ہیں، جس کے دلائل خود ظنی ہیں، ان میں کسی جانب کا جزم کر لینا احداث فی الدین ہے؛ اس لئے مذہب حنفی کے کسی مسئلہ کو اس طرح ترجیح دینا کہ شافعی مذہب کے ابطال کا شبہ ہو، یہ طرز پسندیدہ نہیں'' (انفاسِ عیسیٰ: ۶۳۳)۔

حضرت تھانویؒ کے یہاں اس باب میں اس قدر توسع تھا کہ فرماتے ہیں:

''میرا ارادہ تھا کہ ایک رسالہ احکام معاملات میں ایسا لکھوں کہ جن معاملات میں عوام مبتلا ہیں، اگر وہ صورتیں کسی مذہب میں بھی جائز ہوں تو اس کی اجازت دے دوں؛ تاکہ مسلمانوں کا فعل کسی طرح سے تو صحیح ہو سکے، میں نے احتیاطاً اس کے بارے میں حضرت مولانا گنگوہیؒ سے بھی دریافت کیا کہ ایسے مسائل میں دوسرے مذہب پر فتویٰ دینا جائز ہے یا نہیں؟ تو حضرت نے بھی اجازت دے دی، مولانا بہت پختہ حنفی تھے'' (کلمۃ الحق:۱۷)۔

اور یہ توسع خدانخواستہ نفس پرستی پر مبنی نہیں تھا؛ بلکہ مقصد یہ تھا کہ لوگوں میں شریعت کی محبت پیدا ہو اور وہ اپنے اوپر احکام شریعت کو بوجھ نہ سمجھنے لگیں، چنانچہ حضرت تھانویؒ فرماتے ہیں:

''مختلف فیہ مسائل میں وسعت دینی چاہئے، اس طرح ایک تو شریعت سے محبت ہوگی،

دوسرے آرام رہے گا'' (انفاس عیسیٰ ۲ / ۳۳۴)۔

اگر کوئی شخص نصوص اور فقہاء کے اجماع واتفاق سے آزاد ہو کر فتویٰ دینے لگے، مقصد شریعت کے پردہ میں خود شریعت ہی سے آزاد ہونا اور اپنے کاندھوں سے تکلیف کے بوجھ کو اتار پھینکنا چاہتا ہو، اس کے لئے شذوذ ونوادر کی تلاش کی جائے اور اس کو مہمیز بنا کر خواہشاتِ نفس کی اتباع کا دروازہ کھولا جائے، تو یہ اباحیت ہے، جو ضلالت وگمراہی اور زیغ وکجروی ہی نہیں؛ بلکہ بعض اوقات انسان کو کفر کے دروازہ تک پہنچا دیتی ہے: أعاذنا الله منه؛ لیکن امت کی واقعی ضروریات کو دیکھتے ہوئے کتاب وسنت کی نصوص، ائمہ متبوعین کے اجتہادات اور مشائخ مذہب کے فتاویٰ اور تخریجات کے دائرہ میں رہتے ہوئے کسی خاص جزئیہ میں فقہی عدول سے کام لیا جائے؛ بلکہ اپنے زمانہ کے احوال اور عادات کی روشنی میں ان احکام کی تطبیق کی جائے، تو یہ دین سے بے دینی کی طرف نہیں؛ بلکہ دین سے دین کی طرف سفر ہے، اس کا مقصد لوگوں میں شریعت اسلامی کی محبت پیدا کرنا ہے، اس کا منشاء یہ بتانا ہے کہ دین ایسا بوجھ نہیں جسے اٹھایا نہ جا سکے؛ بلکہ اس کے دامن میں بڑی فراخیاں اور وسعتیں ہیں، اس کا مقصود لوگوں میں یقین پیدا کرانا ہے، کہ شریعت میں ہر عہد کی مشکلات اور انسانی ضروریات کا حل موجود ہے اور انسان کے واقعی اور حقیقی مسائل کو حل کرنے لئے شریعت کے دائرہ سے باہر جانے کی ضرورت نہیں؛ بلکہ قواعد شرع کے دائرہ میں رہتے ہوئے اپنے عہد اور زمانہ پر اس کی تطبیق کی ضرورت ہے۔

حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ نے اس بات کو اصولی انداز میں لکھا ہے، اور ایسا بہتر تجزیہ کیا ہے، جو آپ ہی کا حق تھا، جس کا حاصل یہ ہے کہ مذاہب فقہیہ قابل ترجیح ہیں نہ کہ لائق تبلیغ؛ چنانچہ فرماتے ہیں:

> ''پس اپنے مذہب کی ترجیح پیشِ نظر ہوتی ہے، دوسرے مذہب کا ابطال پیشِ نظر نہیں ہوتا؛ کیوں کہ علماء دیوبند کے مسلک پر یہ متعدد اور باہم مختلف فقہی ترجیحی مذاہب ہیں، تبلیغی مذاہب نہیں، تبلیغ اس حق کی ہوتی ہے، جس کے مقابلہ میں باطل ہو؛ تاکہ لوگ باطل کو چھوڑ کر حق کی طرف آئیں، نہ کہ اس حق کی کہ اس کے مقابلہ میں بھی حق ہی ہو؛ ورنہ

یہ ابطال حق ہوگا نہ کہ ترجیح، فرق اتنا ہے کہ منصوص اور غیر متعارض مسائل میں حق حقیقی ہوتا ہے؛ اس لئے اس کا مقابل باطل کہلائے گا، جس کی تردید کی جائے گی، اور مختلف فیہ مسائل میں خواہ ان کا ثبوت اجتہاد سے ہو یا متعارض نصوص میں مجتہد کی جانب سے ترجیح دے کر ایک جانب متعین کی گئی ہو، حق اضافی ہوتا ہے، جو دونوں جانبوں میں ممکن ہے؛ اس لئے تردید یا ابطال کا یہاں کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا'' (علماء دیوبند کا دینی رُخ: ۱۴۴)۔

خانوادۂ قاسمی کے چشم و چراغ اور علوم نانوتوی کے امین استاذ گرامی حضرت مولانا محمد سالم قاسمیؒ نے اس اصول کو اپنے مختلف خطابات میں مزید واضح فرمایا؛ چنانچہ ایک جگہ فرماتے ہیں:

''لیکن اس سلسلہ میں ایک بنیادی فرق کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے کہ فقہاء کا مستنبط کردہ قانون اسلامی دین کے درجہ میں نہیں ہے، دین وہ ہے جو منزل من اللہ ہے، جس میں عقل انسانی قطعاً دخیل نہیں ہے، ظاہر ہے کہ جس کے اندر عقل انسانی دخیل ہو تو وہ قابل تبلیغ نہیں ہوسکتا، قابل تبلیغ صرف دین منزل من اللہ ہی ہوگا، بخلاف مذاہب فقہاء کے، کہ وہ اجتہادی اور استنباطی ہیں؛ اس لئے ان کا درجہ ترجیحی ہوسکتا ہے، تبلیغی نہیں ہوسکتا، اگر ان کو درجۂ تبلیغ دے دیا جائے تو یہ دین منزل کے ساتھ ناانصافی ہوگی'' (دین اور فقہی مذاہب و مسالک: ۱۱)۔

آگے فرماتے ہیں:

''لیکن دور حاضر میں انحطاط علمی بعض افراد و طبقات میں یہاں تک پہنچ گیا ہے کہ انھوں نے دین منزل من اللہ اور خطا و صواب کا احتمال رکھنے والے مجتہد فیہ فقہ سے ماخوذ و مستنبط مسالک کو تبلیغی بنا کر دین کے ہم پلہ بنا رکھا ہے، جب کہ مدار نجات اور مستحق تبلیغ فقط دین ہے، مذہب فقہی اور مسلک مختار نہ مدار نجات ہیں اور نہ مستحق تبلیغ ہیں'' (دین اور فقہی مذاہب و مسالک: ۱۱)۔

فروعی مسائل میں توسع کا کیا فائدہ ہے، اس پر روشنی ڈالتے ہوئے فرماتے ہیں:

''راہ تقویٰ ارباب ہمت و عزیمت کے لئے ہے؛ لیکن فتویٰ کی وسعتیں اس دین فطرت، اسلام میں کم ہمت اور بے عزیمت عوام کے لئے ہیں، ان کو عزیمت و ہمت کی راہوں

پر چلانے کی کوشش ان کے قلموں کو صراط مستقیم سے ڈگمگانے کا ذریعہ بن سکتی ہیں‘‘ (خطبات خطیب الاسلام ۱/ ۱۹۰)۔

کلام وعقیدہ کے باب میں:

جو اعتدال علماء دیوبند کے یہاں مسائل فقہیہ میں ہے، وہی اعتدال عقیدہ وکلام میں بھی ہے؛ چنانچہ حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ فرماتے ہیں:

’’اس بارے میں خود علماء دیوبند ہی کے عرف میں تو وہ ماتریدی ہی کی نسبت سے معروف ہیں؛ لیکن ان ہی میں سے ایک جماعت ان کے اشعری ہونے کی رائے بھی رکھتی ہے، اوّلاً اس لئے کہ اُن کے علمی مورثِ اعلیٰ حضرت الامام شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ ہیں، ان کے کلام سے مترشح ہوتا ہے کہ وہ اشعری ہیں؛ اس لئے علمائے دیوبند کو بھی وہ اشعری سمجھتے ہیں، دوسرے اس لئے کہ اکابر دیوبند اپنے درسوں، تقریروں اور قلمی تحریروں میں مسائلِ اشعریت کا پاس ولحاظ رکھتے ہیں؛ لیکن لقب کے لحاظ سے ان دونوں قوموں کو سامنے رکھ کر جو وجوہِ قبول سے خالی نہیں ہیں، اُن کے ماتریدیت اور اشعریت کے ملے جُلے رُخ کو سامنے رکھ کر اگر انھیں اشعریت پسند ماتریدی کہا جائے تو ان کے کلامی مزاج کے حسبِ حال ہوگا، جب کہ وہ جامع بین الاشعریت والماتریدیت ہی نظر آتے ہیں؛ بلکہ اُن کے جامعیت آفریں مباحث دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ اُن کے نزدیک اشعریت اور ماتریدیت کے اختلافات آخر کار نزاع لفظی ثابت ہوتے ہیں، کوئی حقیقی نزاع نظر ہی نہیں آتا‘‘ (علماء دیوبند کا دینی رُخ: ۱۵۶)۔

عقائد کے باب میں بزرگان دیوبند عام طور پر متشابہات پر گفتگو کرنے سے گریز کرتے ہیں، اور اسی کی تلقین بھی کرتے ہیں؛ لیکن جہاں اس کی تفصیل کرنی ہوتی ہے، وہاں گاہے تفویض سے کام لیتے ہیں، اور گاہے تاویل سے، اس سلسلہ میں حضرت تھانویؒ کا رسالہ ’’**التواجه بما يتعلق بالتشابه**‘‘ دیکھا جا سکتا ہے (بیان القرآن ۲/ ۳، تاج پبلیشر)۔ اسی طرح استواء علی العرش کے سلسلہ میں علماء دیوبند کی تشریحات کو سامنے رکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ محدثین سے

بہت قریب ہیں، غرض کہ علماء دیوبند نے علماء ربانیین کے تینوں گروہوں کے مذہب کو جمع کرنے کی کوشش کی ہے: اشاعرہ، ماتریدیہ اور محدثین، اسی پس منظر میں شیخ محمد بن عبدالوہاب نجدیؒ کے بارے میں حضرت گنگوہیؒ کے فتویٰ کو دیکھا جاسکتا ہے؛ چنانچہ ایک سوال کے جواب میں فرماتے ہیں:

''محمد بن عبدالوہاب کے مقتدیوں کو وہابی کہتے ہیں، ان کے عقائد عمدہ تھے اور مذہب ان کا حنبلی تھا؛ البتہ ان کے مزاج میں شدت تھی، مگر وہ اور ان کے مقتدی اچھے ہیں، مگر ہاں جو حد سے بڑھ گئے ہیں، ان میں فساد آ گیا ہے اور عقائد سب کے متحد ہیں، اعمال میں فرق، حنفی، شافعی، مالکی، حنبلی کا ہے'' (فتاویٰ رشیدیہ: ۲۸)۔

احسان وتصوف میں:

علماء دیوبند کے یہاں یہ اعتدال تصوف اور صوفیاء کے بارے میں بھی پایا جاتا ہے، ان کے یہاں صلحاء امت کا بھر پور احترام بھی ہے؛ لیکن اگر ان کی کوئی بات شریعت سے ہٹی ہوئی ہو تو اس کو قابل قبول نہیں سمجھا جاتا، اس کا اس سے بڑھ کر کیا ثبوت ہوگا کہ حضرت نانوتویؒ اور حضرت گنگوہیؒ، حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ کے بعض افعال سے متفق نہیں تھے، اور علماء دیوبند نے برملا ایسی باتوں پر رد کیا ہے، حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ نے اس پر تفصیل سے گفتگو کی ہے (دیکھئے: علماء دیوبند کا دینی رخ اور مسلکی مزاج: ۱۲۶--۱۳۸) اسی کا ایک اقتباس یہاں نقل کیا جاتا ہے:

''لیکن طریقت کو شریعت سے الگ کوئی مستقل راہ نہیں سمجھتے جو سینہ بہ سینہ چلی آرہی ہے؛ بلکہ شریعت ہی کے باطنی اور اخلاقی حصہ کو طریقت کہتے ہیں، جو اصلاحِ قلب کا راستہ ہے اور جسے شریعت نے احسان کہا ہے؛ اس لئے اُس کے بنیادی اصول کو کتاب وسنت ہی سے ثابت شدہ جانتے ہیں، اور ثابت کرتے ہیں؛ مگر اس لائن کی بے اصول یا خلاف اصول یا من گھڑت رواجی رسوم کو طریقت نہیں سمجھتے، بعض رسوم کے اختیار کرنے کو خلافِ سنت اور بعض کے ارتکاب کو بدعت سمجھ کر قابل رد سمجھتے ہیں، محض

رواجات یا رسمی حال وقال یا نمائشی اُچھل کود یا اہل حال کے مغلوبانہ کلمات وافعال کی نقالی اور اس کے خلاف پر فتویٰ بازی اور تکفیر سازی کو تصوف یا طریقت نہیں سمجھتے؛ بلکہ گروہی جذبات اور تعصّبات کا مظاہرہ سمجھتے ہیں'' (علماء دیوبند کا دینی رُخ: ۱۳۰)۔

اسی لئے تصوف کے جو اشغال لوگوں کے لئے غلط فہمی کا سبب بن سکتے تھے اور ناسمجھی کی وجہ سے گمراہی کا سبب ہو سکتے تھے، ان کو انھوں نے رد کر دیا؛ چنانچہ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ تصور شیخ کے بارے میں فرماتے ہیں:

''تصور شیخ جو معمول صوفیہ کا ہے، کسی وقت میں صوفیہ نے اس کو اختیار کیا تھا، کسی مصلحت کی وجہ سے اور اس میں کوئی خدشہ نہیں جانا گیا تھا؛ مگر اب اس وقت میں اس کی اجازت شرعی نہیں معلوم ہوتی کہ شائبہ بُت پرستی ہو گیا ہے اور اس کی چنداں ضرورت بھی نہیں'' (باقیات فتاویٰ رشیدیہ: ۴۲۵)۔

بعض دفعہ اشغال تصوف میں مشغولیت اس درجہ بڑھ جاتی ہے کہ علمی اشتغال کم یا ختم ہو جاتا ہے، اس پس منظر میں حضرت گنگوہیؒ کی یہ نصیحت دونوں کے درمیان اس توازن کو ظاہر کرتی ہے جو علماء دیوبند علوم ظاہری سے شغف اور اشغال تصوف کے درمیان قائم رکھتے تھے؛ چنانچہ فرماتے ہیں:

''اس واسطے ہی شغل کرنا طالب علم کو و مدرس کو، بندہ جائز نہیں جانتا، اور ہمیشہ بیعت وشغل سے انکار کرتا ہے، وہی امر آپ کو پیش کیا، پس اب جس قدر ذکر اور شغل بدون حرج تدریس ہو سکے، کر لیا کرو، اور فکر ایسی خلوت اور استغراق کی ہرگز ہرگز مت کرنا کہ یہ وسوسہ ہے اور کسی کے کہنے سننے سے تمام عمر کی محنت کو کہ علم ہے، رائیگاں مت کرنا، اور حجت اپنے اوپر قائم کر کے معصیت میں مبتلا مت ہونا، اگر جورو بچہ کو چھوڑ کر بخیال درویشی نکلو گے تو فردا قیامت کو حقوق العباد کا کیا بندوبست اور جواب دو گے؟ اور جو تعلیم درس کو چھوڑ کر نفع متعدی کو ترک اور نفع لازمی کی تحصیل میں جو موہوم ہے، مشغول ہو گے تو فخر عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو کیا جواب دو گے، کہ فرماتے ہیں: بلّغوا عنی ولو آیة (الحدیث) لیبلغ الشاهد الغائب (الحدیث) اور دیگر احادیث کہ جس میں تبلیغ کو

فرض اور علم کو واجب وعمدہ شغل اور عبادت فرض اس کو فرمایا ہے اور شغل تصوف وریاضت کہ ادب ومستحب ہے، اس میں منہمک ہو کر فرض کو ترک کر کے کیا نفع حاصل کروگے، بجز مطالبہ عباد اور شارع علیہ السلام کے'' (باقیات فتاویٰ رشیدیہ: ۴۲۰)۔

چنانچہ قریب قریب تمام ہی اکابر دیوبند تصوف کی نسبت سے بھی مالا مال تھے؛ لیکن انھوں نے ہمیشہ اس راہ میں اعتدال کو قائم رکھا۔

عصری علوم:

ہندستان میں جب انگریز آئے تو اپنی زبان اور اپنی ثقافت بھی ساتھ لائے، اس وقت مسلمانان ہند کے دو حلقے ہو گئے، ایک ان لوگوں کا جنھوں نے انگریزی زبان کے ساتھ ساتھ انگریزی تہذیب وثقافت اور مغربی افکار کو بھی قبول کرلیا، ہندستان کی ایک مشہور درسگاہ اس کی نمائندہ تھی، اس کے مقابلہ میں کچھ لوگ وہ تھے، جنھوں نے انگریزی پڑھنے ہی کو منع کر دیا، اور اس کی وجہ یہ تھی کہ جن لوگوں نے مغربی علوم کو حاصل کیا تھا، وہ آخر انکار حدیث، انکار معجزات اور بہت سے مسلمات دین کے انکار تک پہنچ گئے تھے، علماء دیوبند نے حالاں کہ ایسے نام نہاد روشن خیالوں کی تردید میں بھرپور جدوجہد کی؛ لیکن پھر بھی اس میں اعتدال کا راستہ اختیار کیا گیا؛ چنانچہ حضرت گنگوہیؒ نے فتویٰ دیا:

''انگریزی زبان سیکھنا درست ہے؛ بشرطیکہ کوئی معصیت کا مرتکب نہ ہو اور نقصان دین میں اس سے نہ آوے'' (فتاویٰ رشیدیہ: ۵۷۴)۔

چوں کہ اس زمانہ میں اسکولوں میں بہت سی خلاف شرع باتیں ہوا کرتی تھیں، اور طلبہ کو انجیل وغیرہ بھی پڑھائی جاتی تھی؛ اس لئے حضرت گنگوہیؒ نے فرمایا:

''انگریزی زبان کا سیکھنا مباح ہے، نفس تعلیم زبان میں کوئی معصیت نہیں، مگر امر مباح اختلاط غیر مشروع سے ناجائز ہو جاتا ہے: بقولھم :اذا اجتمع الحلال و الحرام غلب الحرام، پس انگریزی زبان کا خارج مدرسہ میں سیکھنا؛ بشرطیکہ کوئی ممنوع شرعی

اس کے ساتھ نہ ہو، مباح ہے اور اسکول میں داخل ہو کر پڑھنا ممنوع ہے'' (باقیات فتاویٰ رشیدیہ: ۴۰۳)۔

پھر غالباً بعض ایسے مدارس بھی قائم ہوئے جن میں منکرات نہیں رہی ہوں گی تو آپ نے ایک قدم آگے بڑھ کر فرمایا:

''غیر زبان سیکھنا جائز ہے؛ تاوقتیکہ کوئی امر حرام عارض نہ ہو، مدرسہ میں اگر سیکھے تو بھی جائز ہے'' (باقیات فتاویٰ رشیدیہ: ۴۰۴)۔

یہ واقعہ مشہور ہے کہ حضرت نانوتویؒ کی سفر حج کے درمیان ایک اٹالین کپتان سے ملاقات ہوئی، اس نے بعض مذہبی مسائل پر حضرت نانوتویؒ سے بات کی، وہ آپ کے جوابات سن کر اتنا متأثر ہوا کہ قریب تھا کہ مسلمان ہو جائے، اس موقع پر حضرت نانوتویؒ نے عزم فرمایا کہ ہندستان پہنچ کر انگریزی زبان سیکھوں گا؛ تاکہ اسلام کی دعوت واشاعت کے لئے اس کا استعمال کیا جائے، اس پس منظر میں حضرت مولانا مناظر احسن گیلانیؒ فرماتے ہیں:

''لیکن افسوس ہے کہ اجل مسمی نے واپس ہونے کے بعد فرصت نہ دی، کاش! یہ صورت پیش آجاتی تو دارالعلوم دیوبند کی علمی تحریک کا رنگ یقیناً کچھ اور ہوتا، لوگوں کو اکابر دیوبند کے خیالات سے صحیح واقفیت نہیں ہے؛ ورنہ جن تنگ نظریوں کا الزام ان پر عائد کیا جاتا ہے، اس سے ان بزرگوں کی ذات بری ہے'' (الامام محمد قاسم نانوتوی، حیات، افکار، خدمات: ۲۸۴)۔

دارالعلوم اور مظاہر علوم وغیرہ کا جو نصاب بنایا گیا اور اس میں عربی وفارسی کے علاوہ دوسری زبان اور جدید علوم کو داخل نہیں کیا گیا تو اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ بانیان دارالعلوم اس کو شجر ممنوعہ قرار دیتے تھے؛ بلکہ یہ وقت اور حالات کا تقاضہ تھا، جس کا خود حضرت نانوتویؒ کی تحریروں میں ذکر موجود ہے، اور وہ مصلحت یہ تھی کہ عصری علوم کی تعلیم کے لئے تو بہت سے ادارے موجود تھے؛ لیکن دینی مدارس کو حکومت برطانیہ نے بند کر دیا تھا، دوسری طرف فتنۂ ارتداد کا طوفان امت مسلمہ کو اپنے گھیرے میں لئے ہوئے تھا؛ اس لئے ضروری تھا کہ کچھ

لوگوں کو خاص طور پر علوم دینیہ کا ماہر بنایا جائے اور وہ درجۂ کمال کو پہنچ جائیں؛ تا کہ اس فتنہ کا مقابلہ کرسکیں؛ چنانچہ جدید علوم کو کیوں داخل نصاب نہیں کیا گیا ہے، اس کا جواب دیتے ہوئے خود حضرت نانوتویؒ فرماتے ہیں:

''سو اہل عقل پر روشن ہے کہ آج کل تعلیم علوم جدیدہ تو بوجہ کثرت مدارس سرکاری اس ترقی پر ہے کہ علوم قدیمہ کو سلاطین کے زمانۂ سابق میں بھی یہ ترقی نہ ہوئی ہوگی'' (الامام محمد قاسم نانوتوی، حیات، افکار، خدمات: ۲۷۸)۔

اس کے ساتھ ساتھ دارالعلوم کے نصاب میں معقولات کے مضامین بھی رکھے گئے، اور حضرت نانوتویؒ نے اس کی وجہ یہ بتائی کہ ''ان سے استعداد علوم مروجہ اور استعداد علوم جدیدہ یقیناً حاصل ہوتی ہے''؛ لیکن حسب موقع وضرورت دوسری زبانوں کو بھی دارالعلوم کے نصاب میں وقتاً فوقتاً داخل کیا گیا؛ چنانچہ مولانا گیلانیؒ رقمطراز ہیں:

''جاننے والے جانتے ہیں کہ دارالعلوم دیوبند میں جب کبھی موقع ہمدست ہوا، ہندو دھرم کی علمی زبان سنسکرت کے سکھانے کا بھی نظم کیا گیا ہے، یا وظیفہ دے کر طلبہ کو ان زبانوں کے سیکھنے کے لئے بھیجا گیا، اور آج بھی ضرورت ہے کہ کچھ نہیں تو کم از کم ہندستان کے مروجہ ادیان ومذاہب کے متعلق صحیح معلومات سے دارالعلوم کے طلبہ کو روشناس کرانے کی ممکنہ صورتیں اختیار کی جائیں، میرا خیال تو یہ ہے کہ اسلامیات کا جو ذخیرہ اردو زبان میں پایا جاتا ہے، اس سے بھی زیادہ سرمایہ اسلامی تعلیمات کا ہندی میں منتقل کر دیا جائے، ہمارا یہ ایک تبلیغی فرض ہے، انشاء اللہ یہ خواب پورا ہو کر رہے گا'' (سوانح قاسمی ۲/۴۷۹)۔

افسوس کہ حضرت نانوتویؒ نے جو جدوجہد کی تھی، اور اس کی روشنی میں حضرت گیلانیؒ نے جو خواب دیکھا تھا، وہ تشنۂ تعبیر ہی رہا؛ لیکن اب ایسے حالات پیدا ہو رہے ہیں اور ذمہ داروں کی طرف سے ایسے خیالات کا اظہار ہوا ہے، جس سے امید قائم ہوئی ہے کہ ان شاء اللہ مستقبل قریب میں یہ خواب حقیقت بن جائے گا۔

حضرت نانوتویؒ یہ بھی چاہتے تھے کہ طلبہ دارالعلوم دیوبند کا نصاب پڑھنے کے بعد عصری درسگاہوں میں جا کر علوم جدیدہ کو حاصل کریں؛ تاکہ ان کے کمال میں اضافہ ہو؛ چنانچہ حضرت نانوتویؒ نے فرمایا:

''اس کے بعد یعنی دارالعلوم دیوبند کے تعلیمی نصاب سے فارغ ہونے کے بعد اگر طلبہ مدرسہ ہذا مدارس سرکاری میں جا کر علوم جدیدہ کو حاصل کریں تو ان کے کمال میں یہ بات زیادہ مؤید ثابت ہوگی'' (امام محمد قاسم نانوتوی: ۲۸۰...)۔

اُس وقت مدارس کے نصاب میں منطق وفلسفہ کو بھی شامل رکھا گیا تھا، یہ اس وقت کی ضرورت تھی؛ کیوں کہ اس وقت مدارس اسلامیہ پر ان فنون کا غلبہ تھا اور کانپور اس کا مرکز تھا، یہاں تک کہ کوئی قرآن وحدیث کا کتنا ہی بڑا عالم ہو، اگر معقولات پر اس کی دست گاہ نہ ہو تو اس کو ناقابل توجہ سمجھا جاتا تھا، نیز علم کلام اور اصول فقہ وغیرہ کی بہت سی باتیں معقولی اسلوب میں کہی گئی تھیں، ان کو سمجھنے کے لئے فلسفہ ومنطق کی اصطلاحات وتعبیرات اور اصول وقواعد کو جاننے کی ضرورت تھی؛ لیکن ہمارے بزرگوں نے اس کو کبھی نظر استحسان سے نہیں دیکھا، اس سلسلہ میں حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کا موقف تو بہت ہی سخت ہے؛ چنانچہ حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوریؒ کو خط لکھتے ہوئے فرماتے ہیں:

''تعلیم صِدرا خود ناپسند ہے، انصاف کرنا چاہئے کہ اثبات ہیولی وصورت، وابطال جزء لایتجزیٰ اور اقرارِ قدَمِ ہیولیٰ وصورت سے کیا مطلب ہے، ابطال قیامت واقرار تعدد قدماء، عدم اختیار جل علا شانہ نہیں تو کیا ہے؟ ان عقائد فاسدہ کو منھ سے نکالنا موجب ظلمت ہے، اور پھر دلائل سے ثابت کر کے طلبہ کو اس پر قائم کرنا، اور شبہات کو رفع کر کے پختہ کرنا ضروری ہے، گو دل میں عقیدہ نہیں؛ مگر کفار کے عقیدہ کا اثبات ہے، اگر اس خیال کی تعلیم پادریوں کے مدرسہ میں کرے اور عقیدہ بطلان تثلیث وغیرہ ہو تو کیوں برا جانتے ہیں، یہاں بھی وہی ہے، پہلے زمانہ میں بضرورت ابطالِ مذہب فلاسفہ اور معتزلہ، اس کو پڑھنے کی ضرورت تھی کہ مطلع ہو کر مثل ان قواعد کے جواب دیویں، اب کیا

ضرورت ہے؟ بالکل غلط ہے، سب حیلہ ہے؛ لہٰذا اس نوکری کو جائز نہیں جانتا ہوں''
(باقیات فتاویٰ رشیدیہ: ۴۰۲)۔

افسوس کہ مدارس کے نصاب میں معقولات کی کتابیں تو اب تک موجود ہیں، ہونا تو یہ چاہئے کہ اس کو تکمیل علوم کی جماعت میں رکھا جائے؛ لیکن وہ اصل نصاب کا حصہ ہے؛ مگر دارالعلوم میں جو مضامین بانیٔ دارالعلوم کی حیات میں شامل تھے، جیسے: فلکیات، ریاضی، طب، یہ نصاب سے باہر ہوگئے، ضرورت ہے کہ اہل علم اور ارباب مدارس ٹھنڈے دل سے اس مسئلہ پر غور فرمائیں۔

یہ ہے وہ منہج جو بزرگانِ دیوبند نے اپنے اَخلاف کے لئے دیا ہے، جس میں تقلید بھی ہے، تمام فقہاء ومحدثین کا احترام بھی، نصوص پر عمل کرنے کا اہتمام بھی ہے اور سلف صالحین کے اجتہادات پر اعتماد بھی، جس میں احتیاط اور اباحیت سے حفاظت بھی ہے اور اُمت کی حقیقی ضروریات کا حل اور وسیع الفکری بھی، نیز علم کلام کے ان مختلف مکاتب کو ساتھ لے کر چلنے کا جذبہ بھی ہے، جو اہل سنت کے دائرہ میں ہیں، احکام شریعت کی تشریح وتوضیح میں سلف صالحین کے اجتہاد وبیان سے آزاد ہوجانا بھی دیوبندیت نہیں اور تقلید میں جمود وغلو اور نصوص کے ''شارحین'' کو ''شارعین'' کا درجہ دے دینا بھی دیوبندیت نہیں، اہل سنت کے ایک مکتب کلام میں حق کو منحصر کر لینا بھی دیوبندیت نہیں اور اہل سنت کے مسلمہ نقطۂ نظر سے انحراف اور اعتزال ورفض کی گمراہی میں مبتلا ہوجانا بھی دیوبندیت نہیں، اور شاید اسی کا نام ''فکر ولی اللہی'' ہے، جس کو تمام بزرگانِ دیوبند نے اپنی فکر کا اصل مرجع ومنبع اور سرچشمہ قرار دیا ہے۔

اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا کا قیام نومبر ۱۹۸۹ء میں عمل میں آیا، اور اب اس کی عمر پورے ۳۴ رسال ہوچکی ہے، اس عرصہ میں اُس نے ۱۴۳ مرکزی عنوان کے تحت آنے والے مسائل کو حل کیا ہے، ان سمیناروں میں پیش کئے جانے والے مقالات کی مجموعی تعداد ۴۸۷۳ ہے، ان مقالات پر مشتمل ۱۴۳ مجموعے شائع ہوچکے ہیں، جب کہ اکیڈمی کی جملہ مطبوعات ۲۹۶ ہیں،

سالانہ فقہی سمیناروں کے علاوہ فکری موضوعات ۵۸ سمینار منعقد ہوئے ہیں، ۳۶ تربیتی پروگرام رکھے گئے ہیں، اور مدارس وعصری درسگاہوں میں ۱۷۶ توسیعی خطبات کا اہتمام کیا گیا ہے، یہ سب آپ حضرات کی دعاؤں کا اور تعاون کا نتیجہ ہے، **فجزاکم اللہ خیر الجزاء۔**

اکیڈمی اس موقع پر برہان پور کے بلند ہمت مسلمانوں کی، یہاں کے بابصیرت علماء کی اور خصوصاً حضرت مولانا مفتی رحمت اللہ قاسمی، ان کے رفقاء اور دارالعلوم کی انتظامیہ نیز اساتذہ وطلبہ کی بہت شکر گزار ہے کہ انھوں نے اس سمینار کی میزبانی کی پیش کش فرمائی اور ان کی دعوت پر ہم لوگ اس وقت جمع ہیں، اللہ تعالیٰ اس ادارہ کو ظاہری اور معنوی ترقیات سے نوازے اور ہر طرح کے شرور وآفات سے اس دارالعلوم کی اور ریاست کے تمام مدارس کی حفاظت فرمائے، **وصلی اللہ علیٰ خیر خلقه محمد وعلیٰ آله وصحبه وسلم والحمد لله رب العالمین۔**

☆ ☆ ☆